مسلمان کی زندگی اور اقبالؔ

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا، پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

"بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں" (اقبال)

مسلمان کی زندگی اقبالؔ کی نگاہ میں "نہایت اندیشہ" و "کمالِ جنوں" ہے! "اندیشہ" نام ہے فعلیت عقل کا اور "جنوں" نام ہے شدت محبت کا۔ مومن کو حق تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے۔ الذین آمنوا اشد حبا للہ اور حب اس کی عقل حبِ الٰہی کے نور سے اپنی شمع کو روشن کر لیتی ہے تو اس کی فعلیت کے نتیجہ کے طور پر "نہایت اندیشہ" کا ثمر حاصل ہوتا ہے[1] کیونکہ اور مسلمان کی زندگی کا تار و پود ہی اندیشہ و جنون ہوتے ہیں! ہمیں اس زندگی پر ایک غائر نظر ڈالنی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل کرنی ہے تاکہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ "نہایت اندیشہ" کے عناصر کون سے ہیں اور "کمالِ جنوں" کے اجزار کون سے ہیں ع ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

(۱) کمالِ جنوں | جنون نام ہے عشق کا اور عشق اقبالؔ کی اصطلاح میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو بے دلیل و بے برہان "از روئے جاں"[2] ایسا ماننا کہ جسم خاکی سے بوئے جان آنے لگے۔[3]

عاشقی توحید را بر دل زدن — وانگہے خود را بہ مشکل زدن!

"عاشق"، "اللہ مست" "وخود گزیں" "اپنے دیوانہ پن" "وجنون" کی شدت میں "یقین" و "عزم" کے ساتھ اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہے اور غیر اللہ کی الوہیت سے اپنے دل کو خالی کر لیتا ہے اس کے لئے

---

[1] پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں — وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
[2] لا الٰہ بگو از روئے جاں — تا ز اندام تو آید بوئے جاں
[3] خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صرف اللہ ہی الہ ہیں، اس کے الہ صرف اللہ ہی ہیں! وہ تمام پیغمبروں کے اس متفقہ پیام کو کہ "یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ" [1] یہ کہتے ہوئے کہ

بہ پیچ و تاب خرد گرچہ لذت دگر است — یقین سادہ دلاں بہ ز نکتہ ہائے دقیق!

بے دلیل و برہان دل سے ماننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا ہے! اس کا یہ یقین نتیجہ ہے حق تعالیٰ سے شدتِ حب کا، عشق کا، اور عشق کے فرمان پر وہ اپنی جانِ شیریں سے بھی دریغ نہیں کرتا

عشق اگر فرماں دہد از جاں شیریں ہم گزر
عشق محبوب است و مقصود است جاں مقصود نے (اقبال)

حق تعالیٰ کو "الٰہ" ماننے کے جانتے ہو کہ کیا معنیٰ ہیں؟ الٰہ اسم صفت ہے اور اس کے معنی باجماع اہلِ علم معبود و رب کے ہیں اور قرآن مبین کی آیات اس امر پر دلیل ہیں: وھو الذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰہ" یعنی وہی ذات پاک آسمان و زمیں کی معبود ہے" ام الٰہ غیر اللہ، سبحان اللہ عما یشرکون۔ یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟ جب حق تعالیٰ ہی معبود و رب ہیں تو مومن ذلت و فقر کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑتا ہے، ان ہی سے نفع ضر کی توقع رکھتا ہے، یہی ہے عبادت کا مفہوم! عبادت نام ہے غایت تذلل کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیازمندی کا، اظہار ذلت کا! میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق، میرے مربی، میرے مالک و حاکم میرے معبود ہی کے آگے جھک سکتا ہے اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا۔

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست (اقبال)

حق تعالیٰ کے آگے اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں، محتاج ہوں، میرا معبود غنی ہے، قوت و اقتدار سے متصف ہے، علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، معین ہے، مستعان ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہار فقر و عبودیت کر رہا ہوں اور جانتا ہوں

---

[1] اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی اللہ یا معبود نہیں۔

سارا عالم فقیر ہے، مربوب ہے اور میرا معبود ہی غنی وحمید ہے رب ہے، میں اس کا فقیر ہوکر سارے عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں جس کے دریوزہ گر سارے شاہ وگدا ہیں میرے "کاسہ دریوزہ" کو "جام جم" کردیتا ہے[1] اور سارے عالم سے بے نیاز!

مرد حق بے نیاز از ہر مقام ۔۔۔ نے غلام او را نہ او کس را غلام!
بندۂ حق مرد آزاد است و بس ۔۔۔ ملک و آئینش خدا داد است و بس!
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق ۔۔۔ زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق (اقبال)

میں کفیٰ باللہ وکیلا کہہ کر عبادت واستعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں اور ذل وانقیاد کی نسبت، بندگی وعبودیت کا رشتہ صرف اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لئے نہ امیدوں کا مرکز بن سکتی ہے اور نہ خوف وہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت وبیچارگی وبے بسی میری نظروں میں ہویدا وآشکارا ہو جاتی ہے ؎

مرد حر محکم ز ورد لاتخف ۔۔۔ ما بمیداں سر بجیب او سر بکف
مرد حر از لا الہ روشن ضمیر ۔۔۔ می نہ گردد بندۂ سلطان و میر
بائے خود را آں جہاں محکم نہد ۔۔۔ نبض رہ از سوز او برمی جہد
جان او پائندہ تر گردد ز موت ۔۔۔ بانگ تکبیرش بروں از حرف وصوت (اقبال)

نہایت جنون یا عشق یا توحید الوہیت کا پہلا حکم توحید معبودیت ہے جس کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک وحاکم قرار پاتے ہیں اور مستحق بندگی وعبادت ٹھہرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک وحاکم ہی کے سامنے بکمال عجز وعبودیت جھکتا ہے جس کے آگے ساری کائنات بنجوائے اِنِ الرَّحمٰنِ عبداً سرنگوں ہے اور دوسرا حکم توحید ربوبیت ہے جس کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں، وہی خالق ہیں، وہی نافع وضار ہیں، وہی غنی کرتے ہیں اور وہی فقیر کرتے ہیں وانہ ھو اغنیٰ واقنیٰ وہی رلاتے

---

[1] چوں مقام عبدہ محکم شود ۔۔۔ کاسۂ دریوزہ جام جم شود

اور ہنساتے ہیں وانہ ھو اضحک وابکی، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے اور ان ہی سے ہم مدد واعانت کے لئے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کردیتی ہے! یا بقول اقبال ہمیں "فقر غیور" سے مالامال کردیتی ہے!

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات (اقبال)

حق تعالیٰ کی معبودیت وربوبیت پر یہ یقین، یہ ایمان مومن کے قلب کی گہرائیوں میں متمکن ہوتا ہے، اس کے تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہوتا ہے، رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ علم الیقین کے درجے سے گزر کر عشق کے باعث حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور ہمیں ایسی شخصیت کی تخلیق کرتا ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کرسکتی۔ وہ محض شخصیت (Personality) نہیں۔ قانونِ الٰہی (Principle) ہوتا ہے۔ اسی لئے اقبال لاالٰہ الا اللہ کو "نقطہ اودارِ عالم" اور "انتہائے کارِ عالم"[1] ٹھیراتے ہیں اور وجد انگیز الفاظ میں اس کو ملتِ بیضا کی جان قرار دیتے ہیں۔

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — پردہ بند از شعلۂ افکارِ ما
حرفش از لب چوں بدل آید ہمی — زندگی را قوت افزا ید ہمی! (اقبال)

اور عاشق مجنوں کی زندگی کا واحد مقصد اسی کلمہ کا نشر و تبلیغ ہے جس کو پیش کرکے اس کے محبوب نے کفار مکہ سے کہا تھا کہ اگر تم اس کلمہ کا اقرار کرلو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہوجائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے۔

صد نوا داری چو خون در تن رواں — خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں
زانکہ در تکبیر رازِ بود تست — حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست

---

[1] نقطہ اودارِ عالم لا الٰہ۔ انتہائے کارِ عالم لا الٰہ۔

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمی　　گر مسلمانی نیا سائی دمی

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ　　از علومِ امیئے پیغام دہ!

"اعماقِ حیات" یا قلب کی گہرائیوں میں "توحید" کے اتر جانے کے بعد یا بقول اقبال عشق کا رنگ چڑھ جانے کے بعد اب مسلمان (مومن جانباز) خود کو مشکلاتِ حیات میں گرفتار کرتا ہے "بارِ فرائض" کو سر پر اٹھاتا ہے "مہ و پرویں کی تسخیر" کے لئے "زنجیری آئین" اختیار کرتا ہے، اللہ اور رسول کی اطاعت اختیار کرتا ہے اور نفس و ہوٰی کی اطاعت کو ترک کرتا ہے۔ یہ جنون کا دوسرا جزو ہے! بے دلیل و بے برہان "از روئے جان" علمِ حق کی، جس کی تفصیل قرآن مبین اور سنتِ رسول میں دی گئی ہے اور جس کا دوسرا نام "شرع" ہے، اتباع اختیار کرتا ہے۔ اتباعِ حق و اتباعِ رسول ہی کا نام اتباعِ شریعت ہے۔ یہ علم اللہ کا استعمال ہے اور علمِ نفس یا ہوٰی کا ترک کرنا ہے۔ ہوٰی یا خواہشاتِ نفسی کی اتباع ضلالت و ہلاکت کا باعث ہوتی ہے لو تتبع الھوٰی فیضلك عن سبیل اللہ (پ۲۳ ع ۱۱) واتبع ھوٰہ فتردٰی (پ۱۶ ع ۱۰) جس نے ہوٰی کو اپنا الٰہ بنایا یعنی اس کی پیروی کی باوجود اپنے علم کی بے پایاں وسعت کے وہ گمراہ ہوا: افرئیت من اتخذ الٰھہٗ ھوٰہ واضلہ اللہ علیٰ علم (پ۲۵ ع ۱۹) اسی لئے اقبال علمِ حق کے استعمال پر زور دیتے ہیں جو ان کے الفاظ میں "شریعت کے سوا کچھ نہیں"۔

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست　　اصلِ سنت جز محبت ہیچ نیست!

یا تو گویم سرِ اسلام است شرع　　شرع آغاز است و انجام است شرع!

اس شرعِ مبین کی پابندی اور اتباع مسلماں کی زندگی میں "کمالِ جنوں" یا "شدتِ حب" کا نتیجہ ہے۔ محبت و عشق و جنوں ہی پر اس کی اساس ہے ع اصل سنت جز محبت ہیچ نیست۔ اس کی تاکید صاحب جنون اقبال سے سنو۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰؐ　　گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰؐ

از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است　　در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سر انگشتش دو نیم　　رحمت او عام است و اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی　　از میان معشرِ ما نیستی!

نژادِ نو کے "روشن دماغ"[۵۱] مسلماں زادہ کو جو اقبال کی نظر میں "سراپا تجلی افرنگ"[۵۲] ہے، اور جو وہاں کے عمارت گروں کی محض ایک "تعمیر"[۵۲] ہے یا جو "بیگانہ ز خود و مستِ فرنگ"[۵۳] ہے جو خود "ظلمت آباد" ہے اور جس کا "ضمیر بے چراغ" ہے، مخاطب کر کے اس سلسلہ میں اقبال نے خوب تہدید کی ہے۔ اوّلاً فلسفیوں اور شاعروں اور لکیر کے فقیر دنیا پرست فقیہوں سے اس کو توڑتے ہیں کیونکہ ان کی باتوں میں "لذتِ نظر" نہیں ملتی، وجدان کی شاہانہ بداست نہیں ملتی، یافت و تحقق کی چاشنی نہیں ملتی۔

گزر از آنکہ ندید است و جز خبر ندہد　　سخن دراز کند و لذتِ نظر ندہد
شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہ و حکیم　　اگرچہ نخلِ بلند است برگ و بر ندہد

پھر اس کی غیرت دینی کو ابھارتے ہیں، اس کو خوابِ ادعاست سے جگاتے ہیں، اس کے جذبۂ حریت کو اپیل کرتے ہیں، علم غیر و فکر غیر کی غلامی سے اس کو شرم دلاتے ہیں، اس کی "عینیت" و ماہیت کو یاد دلاتے ہیں، اس کے خودی کے احساس کو بیدار کرتے ہیں، ان کے الفاظ سے ان مسلمان زادوں میں بھی جن میں "عشق کی آگ" بجھ چکی ہے اور جو "راکھ کا ڈھیر" بن چکے ہیں[۵۴]، دینی حمیت کی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں۔ فرماتے ہیں

علم غیر آموختی اندوختی　　روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری　　من ندانم تو توی یا دیگری
عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر　　در گلوئے تو نفس از تارِ غیر

۵۱۔ ۔ ۔ ۔ ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ　　ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
۵۲۔ تیرا وجود سراپا تجلی افرنگ۔ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
۵۳۔ ۔ ۔ ۔ ایں بیگانہ ز خود ایں مستِ فرنگ　　نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ
۵۴۔ ۔ ۔ ۔ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں ہندی راکھ کا ڈھیر ہے۔

برزبانت گفتگوہا مستعار ‏ ‏ در دلِ تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نواہا خواستہ ‏ ‏ سروہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگراں ‏ ‏ جام ہم گیری بوام از دیگراں
آفتاب استی یکے در خود نگر ‏ ‏ از نجومِ دیگراں تابے مخر
تاکجا طوفِ چراغ محفلے ‏ ‏ ز آتش خود سوز اگر داری دلے!

یعنی کفار و مشرکین کے ان علوم کو جو ابطالِ حق و احقاقِ باطل کرتے ہیں تو نے شوق سے سیکھا اور اپنے قلب میں ان کو ذخیرہ کر رکھا ہے، ان کا اثر تیرے چہرہ پر نمایاں ہے، اسی آئین سے تیرا چہرہ دمک رہا ہے اب تو پہچان نہیں پڑتا کہ تو تو ہے یا کوئی اور! تیری عقل اغیار کے افکار کی قیدی ہے۔ تیرے گلے میں یہ سانس بھی تیرا نہیں غیر ہی کا ہے! تیری زبان پر جو گفتگو جاری ہے وہ بھی غیروں کی زبان میں ہے، تیرے دل میں جو آرزوئیں پیدا ہو رہی ہیں یہ بھی اجنبیوں کی ہیں، ان ہی سے مستعار لی گئی ہیں، تیری اپنی نہیں لیکن تو نے ان کو اپنا بنا لیا ہے! تیرے ساغر میں شراب بھی دوسروں ہی کی ہے بلکہ تیرا ساغر بھی تیرا نہیں دوسروں ہی کا ہے! ذرا اپنی حقیقت کی طرف نظر ڈال، تو آفتاب عالمتاب ہے، تجھے دوسروں کے نجوم سے روشنی کو مستعار لینا زیبا نہیں!

تو آئینہ جہاں نمائی ‏ ‏ در تست ہمہ جہاں ممثل!
آیاتِ جمال دلربائی ‏ ‏ در شان تو گشتہ منزل!
اے زبدہ مجمل و مفصل ‏ ‏ اے در تو مفصلات مجمل!

تیرے قلب میں تو توحید کا جلوہ چاہئے، تیرے قلب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جانی چاہئے اور اللہ ہی کی معبودیت و ربوبیت سے تیرے قلب کو منور ہونا چاہئے۔ تیرے قدم اتباع سنت مطہرہ میں گامزن ہونے چاہئیں، اسی نورِ عرفان سے تیری زندگی کی ساری ظلمتیں دور ہونی چاہئیں، تو حق تعالیٰ ہی کے نور میں منفتح ہو کر رہ۔ اسی قلعہ میں محصون رہ، یہ وہ نور ہدایت ہے جس کو عقل از خود حاصل نہیں کر سکتی۔ ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ!

دل زغیراللہ بپرداز اے جواں | ایں جہاں کہنہ درباز اے جواں!
تا کجا بے غیرت دیں زیستن؟ | اے مسلماں مردن است ایں زیستن!
مرد حق بازآفریند خویش را | جز بہ نور حق نہ بیند خویش را
برعیار مصطفیٰ خود را زند | تا جہانے دیگرے پیدا کند (اقبال)

بس دین کا خلاصہ یہی ہے توحید و اتباع شریعت و اجتناب از وقوع در ہاوے بدعت، ان کی اصل محبت عشق یا جنوں کے سوا کچھ نہیں، مسلمان کی زندگی میں "کمال جنوں" کے عناصر یہی ہیں اور بس

بے غم عشق تو صد حیف زعمرے کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتار غمت می بودم (لا اعلم)

(۲) نہایت اندیشہ | مسلمان کی زندگی کا دوسرا اہم جزو اندیشہ یا تفکر و تامل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفکر تابع ہوگا وحی الٰہی کا۔ اسی نور کی ہدایت میں اس کے قدم اٹھیں گے۔ اسی لئے اقبال نے خاص طور پہ یہ بات صاف کردی ہے کہ عقل وہی مستند ہے جو "ارباب جنون" یا اہل عشق کی عقل ہے، جس کی ہدایت نور وحی کر رہی ہے ؎

پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

قرآن کریم میں تامل و تفکر، عبرت و تدبر، نظر و تذکر کی بہت ترغیب آئی ہے اور حدیث میں ایک ساعت کے تفکر کو ساٹھ برس کی عبادت سے بہتر بتایا ہے[۵]۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے قُلْ اِنَّمَا اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا (پ ۲۲ ع ۱۲) یعنی آپ ان سے کہیئے کہ میں تم کو صرف ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک پھر سوچو۔ حق تعالیٰ متفکرین کی تعریف فرماتے ہیں: ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا (پ ۴ ع ۱۱) (آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں غور و فکر کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ان کو لایعنی پیدا نہیں کیا)

---

[۵] ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ (الدیلمی وروی ابو الشیخ من حدیث ابوہریرہؓ)

تفکر، معروف قضایا سے تیسری معرفت کے حاصل کرنے کا نام ہے۔ اگر تم کسی بزرگ سے یہ بات سنو کہ آخرت "اولیٰ بالایثار" قابلِ ترجیح ہے۔ اور اس کی تصدیق کر کے بغیر حقیقتِ امر کی بصیرت حاصل کرنے کے ایثارِ آخرت کے لئے عمل کرنے لگو اور مجرد قول پر اعتماد کر لو تو یہ تقلید ہے عرفان نہیں، لیکن اگر یہ پہچان لو کہ چیز "ابقیٰ" ہے یعنی باقی رہنے والی ہے وہ قابلِ ترجیح ہے اور چونکہ آخرت کی زندگی "ابقیٰ" ہے لہذا وہی قابلِ ترجیح ہے تو یہ نتیجہ دو معروف قضایا کو ذہن میں متحضر کرنے ہی سے حاصل ہوگا، اور منطقیوں کی زبان میں "احضار معرفتین سابقتین" وسیلہ ہوتا ہے معرفتِ ثالث کا اور اسی احضار کو ذہن میں متحضر کرنے کو، تفکر، اعتبار، تذکر، نظر، تامل یا تدبر کہتے ہیں۔

اسی معنی میں تفکر کنجی ہے انوار کی، آغاز ہے بصیرت کا، جال ہے حصولِ علوم کا اور آلہ ہے جلبِ معارف کا! تفکر و تدبر سے کام لینے والے انسان کے لئے ہر شے آئینۂ عبرت ہے۔

اذا المرء کانت لہ فکرۃٌ ففی کل شی لہ عبرۃٌ[1]

تفکر کا ثمرہ علوم بھی ہیں اور احوال بھی اور اعمال و افعال بھی لیکن اس کا خاص ثمرہ علم و معرفت ہی۔ جب قلب میں نورِ معرفت کا دخول ہوتا ہے تو اس کا حال بدل جاتا ہے۔ اسی لئے سقراط علمِ صحیح پر اس قدر زور دیتا تھا، جب قلب کا حال بدلتا ہے تو لازماً اعمالِ جوارح بھی بدل جاتے ہیں۔ نفسیات کا ایک کلی قانون ہے کہ عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم اور علم تابع فکر! لہذا فکر اصل و مبدء ہے تمام محاسن و خیرات کا!

علماءِ نفسیات نے اس قانون کو ایک دوسرے طریقہ سے پیش کیا ہے۔ فکر ہی سے مقاصد و غایات کا تعین ہوتا ہے، مقاصد کردار یعنی اعمال و افعال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے۔ عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت تشکل پاتی ہے اور سیرت ہی سے ہماری قسمت کا تعین ہوتا ہے۔ جیسی سیرت ویسی قسمت، لہذا جیسے افکار و خیالات ویسی ہی کائنات ؏

تو جہانے بر خیالے ہیں رواں (رومی)

---

[1] جب انسان کو فکر کا ملکہ حاصل ہوتا ہے تو ہر شے سے اس کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔

انا عند ظن عبدی بی[۵] ! دیکھو تفکر ہی پر کردار و سیرت کا مدار نظر آتا ہے! لہٰذا اس کی اہمیت ظاہر ہے! اسی لئے عارف رومی نے فرمایا ہے ؎

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ ما بقی استخواں و ریشۂ
گر گلست اندیشہ تو گلشنی در بود خارے تو ہیمہ گلخنی!

اقبال مسلمانوں کو کورانہ تقلید سے منع کرتے ہیں اور تفکر و تدبر کی ترغیب دیتے ہیں:-

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن!
ملت مسلم ز آیات خدا است اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
از اجل ایں قوم بے پرواستی استوار از نحن نزلنا استے

بلاشبہ زمین و آسمان کی تخلیق میں اور رات دن کے اختلاف میں اہل عقل کے غور و فکر کے لئے بے شمار دلائل اور نشانیاں ہیں:- اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ[۶] اس کی تفسیر اقبال یوں کرتے ہیں۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

"بینائی" یا نظر و تفکر کے ساتھ وحی الٰہی کی ہدایتوں سے روشن کردہ قلب بھی ہو تو ہر شے میں جہت حق نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھو ہر شے مخلوق ہے۔ "مسلمان" جس کی زندگی میں اندیشہ و فکر کا عنصر نہایت قوی ہوتا ہے مخلوق کو دیکھکر اپنے ذہن کو خالق کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ہر طرف اس کو حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ اَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ کی تصدیق کرنے لگتا ہے۔ جب اس کی توجہ شی کی سلبی جہت سے ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں تو اس کے قلب میں حق تعالیٰ کی یاد قائم ہو جاتی ہے۔ اس کا معروض فکر اب شے نہیں حق ہوتا ہے اور ان انوار سے اس کا قلب معمور ہونے لگتا ہے جو وجہ اللہ کی طرف رخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں فکر و نظر کے

---

[۵] رواہ البخاری۔ [۶] پ ۴ ع ۱۱۔

اسی اصول کو پیشِ نظر رکھکر جامی سامی نے فرمایا تھا۔

گر در دل تو گل گزرد گل باشی ‌ ‌ در بلبل بیقرار بلبل باشی !!

تو جزوی و حق کل است گر روزے چند ‌ ‌ اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اس عقل کو جس کا نتیجہ اس قسم کا تفکر یا اندیشہ ہوتا ہے اقبال اس عقل سے ممیز کرتے ہیں جو (Bragmatsic) یا مادی و انساوی خصوصیت سے متصف ہوتی ہے اور جس کا کام زمین سے اپنی خوراک حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔

اول الذکر کو "عقل جہاں بیں" قرار دیتے ہیں اور ثانی الذکر "عقل خود بیں" ایک تو گمان وظن و تخمین میں مبتلا ہے دوسری پردوں کو چاک کرتی ہوئی اپنے منتہیٰ و مقصود تک جا پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است ‌ ‌ بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آنکہ بردانۂ افتادہ ز خاک ‌ ‌ آنکہ گیرد خورش از دانۂ پروین دگر است

دگر است آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم ‌ ‌ آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسرین دگر است

دگر است آں سوے زیرِ پردہ کشادن نظری ‌ ‌ ایں سوئے پردہ گماں و ظن و تخمین دگر است

اے خوش آں عقل کہ پنہائے دو عالم با اوست

نورِ افرشتہ سوزِ دلِ آدم با اوست

یہ عقل سوزِ عشق سے آشنا اور نورِ معرفت سے روشن ہوتی ہے اور اسی کی فعلیت کا نام اندیشہ و فکر ہے جو مسلماں کی زندگی کا ایک قوی عنصر ہوتا ہے۔ کمال جنون و نہایت اندیشہ سے جس کی زندگی مالامال ہوتی ہے اس کا نعرہ اقبال کی زبان میں یہ ہوتا ہے ؎

مسلمانیم و آزاد از مکانیم ‌ ‌ بروں از حلقۂ نہ آسمانیم

بما آموختند آں سجدہ کز وے ‌ ‌ بنائے ہر خداوندے بدانیم